© rasailojaraid.com

جناب شمشاد حسین فاکر

امام اہل سنت حضرت مولانا مفتی محمد اسحٰق سندیلوی رحمہ اللہ

مضمون ذیل جناب شمشاد فاکر کی زیر تصنیف کتاب "اشفاق نامہ" کا جزو ہے جو مولانا موصوف کے والد گرامی چودھری اشفاق حسین مرحوم کے سوانح پر مبنی ہے۔ مضمون میں حالات زندگی کے علاوہ مولانا کی شعری و ادبی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے مصنف کی اجازت اور موقع کی مناسبت کی بناء پر مضمون نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ مولانا کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وفات کے حالات بھی شامل مضمون کر دیئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

صاحب سوانح کے سب سے بڑے بیٹے مولانا حکیم (چودھری) محمد اسحاق صدیقی تخلص شہید ۱۲ فروری ۱۹۱۳ کو اپنے ننہیال کی حویلی واقع کٹرہ ابو تراب خان، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ سندیلہ جائداد کا ہیڈ کوارٹر اور بزرگوں کا آبائی وطن تھا مگر ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ قاعدہ بغدادی، ناظرہ قرآن، خوش خطی، عربی فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے گھر پر حاصل کی، جن میں مولوی عبدالحفیظ سرفہرست ہیں (جو والد کے بھی استاد تھے) جن دنوں والد حضرت گنج لکھنؤ میں بحیثیت کوتوال شہر تعینات تھے، ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے۔ یہاں مولانا شبلی اعظمی، مولانا عبدالودود، مولانا محمد سلیم، مولانا محمد عبدالرحمان، مولانا سید علی زینبی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی سے استفادہ کیا۔ پھر درس نظامیہ کی تکمیل کے لئے مدرسہ عالیہ فرقانیہ (لکھنؤ) میں داخل ہوئے اور مفتی ظہور احمد شیخ الحدیث، مولانا سید علی زینبی، مولانا محمد اسباط اور قاری عبدالمعبود کے زیر تعلیم رہے۔ یہاں دورہ حدیث، تربیت افتا، اور قرات کے مرحلوں سے گزر رہے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں والد کا تبادلہ بحیثیت لکچرر پولیس ٹریننگ اسکول مراد آباد ہو گیا اور وہاں پہنچ کر وہ یکایک علیل ہو گئے۔ مولانا رمضان المبارک میں والد کو دیکھنے مراد آباد گئے اور اس ارادے سے گئے کہ چند دن میں واپس آجائیں گے تاہم والد کے اصرار پر واپسی ملتوی کر دی اور مدرسہ قاسم العلوم، شاہی مسجد، مراد آباد میں داخلہ لے لیا۔ یہاں مفتی مصلح الدین، مولانا عجب نور، اور مولانا محمد میاں جیسے متبحر علماء کی شاگردی میسر تھی۔ مگر یہ ۱۹۲۹ء کی تحریک آزادی اور سول نافرمانی کا دور تھا جس میں اہل مدرسہ بھی شریک تھے، چنانچہ مولانا محمد میاں اور دوسرے علماء کی گرفتاریوں کی وجہ سے تعلیم کا خاصہ نقصان ہوتا رہا۔ مجبوراً اگلے سال والد کی اجازت سے لکھنؤ واپس گئے اور دوبارہ داخلہ لے کر مدرسہ عالیہ فرقانیہ سے مذکورہ بالا مضامین میں تکمیل کے بعد سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد منبع الطب کالج لکھنؤ سے جو وقت کے معروف طبیب حاذق، حکیم ہادی رضا ماہر کے زیر انتظام قائم تھا، طب یونانی کی تکمیل کی حمیات اور قانون کی خصوصی تعلیم حکیم خواجہ شمس الدین سے حاصل کی جن کے دست شفا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح گویا ۱۹۳۵ء میں رسمی تعلیم کا اختتام ہو گیا اور انہوں نے والد کی خواہش پر سندیلہ ہی میں مطب کا آغاز کر دیا۔ اس درمیان "اشفاق منزل" کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور والد کا مستقل قیام وہیں تھا۔ والدین مولانا سے بے حد محبت کرتے تھے اور عرصے سے ان کا گھر آباد دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء (مطابق رجب ۱۳۵۴ھ) کو چودھری محمود علی کی صاحبزادی خدیجہ بیگم سے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی شادی ہو گئی (جنہوں نے "۷" اکتوبر ۱۹۸۲ء کو بمقام کراچی انتقال کیا) رفیقہ حیات کی معیت اور مطب کی مصروفیت کے باوجود لکھنؤ جیسے عظیم الشان شہر کے مقابلے میں شاید سندیلہ کے ماحول میں ان کا جی نہیں لگا۔ بعض احباب اور بزرگوں کے مشورہ پر وہ کانپور چلے گئے اور چمن گنج میں مطب شروع کر دیا۔ یہ بہت بڑا شہر تھا ہم مذاق اصحاب بھی میسر آ گئے اور مطب کے بعد خاصی فرصت بھی۔ چنانچہ کچھ عرصے مدرسہ جامع العلوم میں اور کچھ عرصے حلیم مسلم کالج میں جز وقتی درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دیتے رہے جو در حقیقت ان کے تبلیغی مشن کی ایک صورت تھی۔ یہیں ہومیوپیتھک سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسکا مطالعہ بھی جاری رہا لیکن نہ اسے پیشہ بنایا نہ کانپور کے بعد طبابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ کانپور کے تین سالہ قیام کے دوران ان کا وقت بہت اچھا کٹا تاہم والد کو ان کا اتنی دور رہنا شاق گزرتا تھا اور اتفاق یہ کہ اسی درمیان وہ خاصے بیمار ہو گئے۔ چنانچہ مولانا کو وطن واپس جانا پڑا اور والد کی خواہش کے مطابق انہوں نے کانپور کو خیر باد کہ دیا۔

۱۹۴۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے جو اس زمانہ میں "ندوۃ العلما" لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ تھے، انہیں باصرار طلب کیا اور اسلام کے سیاسی نظام پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کی فرمائش کے ساتھ دارالعلوم میں بحیثیت استاد کام کرنے کی دعوت دی۔ لکھنؤ ایک طرح مولانا کا وطن ہی تھا۔ سندیلہ سے بمشکل ایک گھنٹہ کی مسافت تھی۔ لہذا والد نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ یہاں تقریباً ۲۶، ۲۷ سال اعلیٰ درجات میں تدریسی کتب کے علاوہ منتہی طلبا کو جدید علوم و فنون مثلاً (سیاسیات و معاشیات) کی تعلیم دیتے رہے جن کا عام عربی مدارس میں رواج نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دارالاقامہ کی نگرانی اور طلبا کو چاق چوبند رکھنے کے لئے کھیل کود اور ورزش کا اہتمام بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔

۱۹۴۵ء کے ابتدائی چند مہینوں کے دوران ہندو مسلم سیاسی کشمکش میں تشدد کا رجحان شدت اختیار کر چکا تھا۔ بالخصوص مشرقی پنجاب کی چند غیر مسلم بڑی ریاستیں پورے ملک پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھیں اور جیسے جیسے آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں مسلم اقلیت کے خلاف ایک خونی انقلاب کے آثار واضح ہوتے جا رہے تھے۔ حالات کے مشاہدے، دین کی محبت اور امتہ مسلمہ کی خیر خواہی نے بالآخر انہیں مجبور کر دیا۔ انہوں نے مدرسہ سے اجازت لی اور نیم فوجی تربیت کے لئے بھوپال چلے گئے۔ تاہم اس تربیت کا مقصد نہ تو برادران وطن سے برسرپیکار ہونا تھا نہ جنگجوئی کے لیے کوئی تنظیم بنانا، البتہ خود حفاظتی اور دفاع کے لیے عملی صلاحیت پیدا کرنا ضرور تھا جو بعد میں کام بھی آئی۔ اہل وطن بالخصوص اہل لکھنؤ بلکہ بلا تخصیص مذہب علاقے (اودھ) کے امن پسند اور شائستہ مزاج شہریوں کی بدولت آگ اور خون کے دریا سے گزرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ بہر حال ۱۹۴۶ء میں وہ ایک سال کی تربیت مکمل کر کے بھوپال سے واپس آ گئے اور بدستور تعلیم و تعلم کے فرائض میں مشغول ہو گئے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں جب وہ دارالعلوم کے عمید (مہتمم) کی حیثیت میں کئی سال سے کام کر رہے تھے مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے اپنے مدرسہ جامعتہ العلوم بنوری ٹاؤن کراچی کے لیے انہیں بڑے اصرار کے ساتھ بار بار طلب کیا۔ ۱۹۶۲ء میں والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی بہنیں سب پاکستان میں تھے۔ والدہ بھی اولاد کی للک میں پاکستان جا چکی تھیں، اس لیے انہوں نے مولانا بنوری کی دعوت قبول کر لی کراچی آ گئے اور ابتداءً مدرسہ میں "تخصص فی الفقہ" کے [illegible] کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ بعد میں جب مولانا بنوری نے ان کی علمیت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استفادہ کی خاطر ایک نیا شعبہ التخصص فی الدعوۃ والارشاد، کھولا تو اسکے مشرف مقرر ہوئے اور تقریباً آٹھ ۸ سال تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ مولانا بنوری کے وصال کے بعد انہیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ عوام و خواص کی اصلاح اور تبلیغ کا کام جسے وہ زندگی کا مشن تصور کرتے تھے ملازمت کی پابند زندگی کے مقابلہ میں زیادہ توجہ، وقت اور آزادی چاہتا ہے، لہٰذا مدرسہ کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ اب بطور خود تصنیف و تالیف، تدریس قرآن اور وعظ و نصیحت میں مشغول رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ "جامعہ مدینتہ العلوم" اورنگ آباد (ناظم آباد کراچی) کی درخواست پر، حسبتہ اللہ افتا کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مدرسہ بنوری ٹاؤن اور اس کے اساتذہ سے رابطہ و تعلقات بدستور قائم ہیں۔

شاعری

شاعری میں معروف ماہر زبان شاعر، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے شاگرد ہیں جن کا شمار اساتذہ لکھنو میں ہوتا ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں شعر کو فنی اعتبار سے پرکھنے اور برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے جو شعر کہنے، بلکہ اچھا شعر کہنے اور تنقید و تبصرہ کی ماہرانہ صلاحیت کے باوجود ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔ میرے کلام (ان کہی) پر تبصرہ کے سلسلہ میں ایک موقع پر "غزل" اور "موضوعاتی نظم" کے فرق کو انہوں نے جس لطیف پیرایہ میں واضح کیا ہے، انہیں کا حق ہے اور اس سے ان کی شعر فہمی اور شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہو سکتا ہے لکھتے ہیں۔

"بوستان شعر و شاعری میں بھی پھولوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک غزل کا چمن ہے، اس کے مقابل دوسرا چمن نظم کا ہے۔ دونوں کے پھول دلکش، دل آویز ہوتے ہیں، مگر تاثیر اور طریق تاثیر میں فرق ہوتا ہے۔ غزل کے ہر شعر میں یہ وصف ہونا چاہیئے کہ وہ سامع کو شاعر کے عالم نفسی میں اس کا ہم نشین بنا دے، مگر نظم کے کمال کا رنگ دوسرا ہے۔ اگر نظم کا ہر شعر اس وصف سے متصف ہو تو مجموعے کا اثر حد سے گزر جائے گا اور سامع ان حدود کو پار کر جائے گا۔ جہاں شاعر اسے لیے جانا چاہتا ہے۔ نظم کا کمال یہ ہے کہ وہ تدریج کے ساتھ، وہ عالم نفسی طاری کر دے جو شاعر طاری کرنا چاہتا ہے اور جو خود شاعر پر طاری ہے۔ جب نظم ختم ہو تو اس کا مجموعی اثر نفسی حیثیت سے سامع کو شاعر بنا دے۔ ناظم ہلکی ہلکی پھوار ڈال کر بالآخر سامع کو شرابور کر دیتا ہے۔ غزل موسلا دھار بارش کی طرح ابتدا ہی سے بھگو دیتی ہے۔ غزل اور نظم کے اس فرق کا ادراک کرنے والے بہت کم ہیں اور نظم میں یہ کمال پیدا کرنے والے اور بھی کم ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دینے سے میرا مقصد صرف اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ مولانا محض روایتی غزل گو شاعر نہیں، غزل گوئی کے فن اور واردات قلبی کے اشتراک سے ان کا ہر شعر دل کو چھیڑتا ہے اور ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے "بیاض" کا اہتمام نہیں کیا ورنہ عشق الٰہی اور حب رسول ﷺ میں ڈوبے، اور لکھنو کی نرم اور شگفتہ زبان میں ڈھلے ہوئے اشعار کا خاصا ذخیرہ میسر آ جاتا۔ نوجوانی کے اشعار میں سے انہیں بمشکل چند شعر یاد ہیں۔ جن پر نہ صرف یہ کہ استاد سے "خلعت" ملا ہے بلکہ استاد کا ----- یا یہ کہئے کہ اب سے ساٹھ سال پہلے والے لکھنو کی شاعری کا رنگ غالب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ آئے جس نے کیا ہو جگر کے خوں سے وضو — میری نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے
دیکھ کر لطف خلش کی آرزو — ان کے خنجر کی روانی کچھ نہ پوچھ

جیسا کہ مذکورہ بالا سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عالم ہی نہیں، متشرع متقی، مرضی مولا! از ہمہ اولا پر ہمہ تن کار بند، دنیا سے بے نیاز، اسلام اور شارع اسلام کے شیدائی، نصرت دین کے لیے قلمی جہاد میں ہمہ دم مشغول، ایسی شخصیت ہیں جس کے ماضی اور حال اور قول و عمل میں ذرا بھی تضاد نہیں، اس لیے ان کی پختہ عمر کی غزل پر ایک متصوفانہ دلکشی، عاشقانہ وارفتگی اور لب و لہجہ کی ملاحت اس طرح غالب ہے کہ ان کا ہر شعر "از لب خیزد و بر دل ریزد" کے مصداق سامع کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے چند شعر دیکھتے ہیں۔

وفور شوق کا عالم، رفاقت جذب کامل کی — نظر آتی رہی ہر گام پر تصویر منزل کی
نہ اب تاب تسلی ہے، نہ ہے طور شکیبائی — ذرا آنسو تھمے، اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی
بوقت دفن آئی یہ صدا، گور سکندر سے — یہاں کی خاک چھانی اور مشت خاک حاصل کی
نشاط بزم سے کیا کہہ رہی تھی، خاک پروانہ — بصد حسرت جو دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی

وہ بڑھا رہے ہیں پیہم، مرا کیف جبہہ سائی — بکمال بے نیازی، بہ جمال دل ربائی
ترا میکدہ سلامت، نہ ہو بدگمان ساقی — مجھے دیکھنے دے ساغر، بہ نگاہ پارسائی
میری سادگی تو دیکھو، کہ نمود صبح سمجھا — مرے اضطراب دل پر شب غم جو مسکرائی
وہ گھڑی تھی کیسی یارب، کہ چنے جنوں میں تنکے — سے جور آندھیوں کے، رہ آسماں نہ پائی

ادائے چشم پرنم، گیسوئے برہم سے کیا ہو گا — لہو میں ڈوبتا ہو دل تو پھر مرہم سے کیا ہو گا
نہ رنگ بوستاں بدلا نہ بوئے گل نہ ہی بلبل — تو پھر سرسبزی شاخ نہال غم سے کیا ہو گا

کیا حسن ناز ہے، دل اندوہگیں کے ساتھ — ہے التجا کا اذن بھی چین جبیں کے ساتھ
روشن ہو تا کہ چشم محبت بھی ساقیا — آنکھوں کو بھی پلا دے، مئے آتشیں کے ساتھ

تصانیف

تصانیف میں "اسلام کا نظام سیاسی" (مطبوعہ ۱۹۴۳ء) سر فہرست ہے جس میں اسلامی ریاست کے سیاسی و معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات کی نشان دہی، قرآن و سنت کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن "دارالمصنفین" اعظم گڑھ (بھارت) سے اور دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن "مجلس الدعوۃ والتحقیق الاسلامی، مدرسہ عربیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنوری ٹاؤن کراچی نے شائع کیا ہے۔ "دعوت دین" اور مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں مسلسل تصنیف و تالیف کرتے رہے ہیں۔ "دینی نفسیات" "اسلامی عبادات" "دعوت فکر" "ایمان و ایمانیات" "نور حیات" "کلمہ اسلام" اردو میں تنویر العینین بتفسیر معوذتین "اور "الفکرۃ السنیہ والحاجۃ المسمیہ" عربی میں تبلیغی نوعیت کی کتابیں ہیں۔

بعض گمراہ کن نظریات کی اصلاح کے سلسلے میں اہلسنت اور نظریہ امامت" اور "اظہار حقیقت بجواب خلافت و ملوکیت" (تین جلد) وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ انگریزی میں "بیہائنڈ دی کرٹن" ایک منفرد تصنیف ہے۔ جس میں اسلام کے خلاف یہودی نیٹ ورک (سازش) کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ رسائل اور اخبارات میں شائع شدہ مضامین اور متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل اس کے علاوہ ہیں جو وقتی ضرورت کے تحت شائع ہوتے رہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، تکمیل ایمان اور تقویٰ کی دعوت دینے کو انہوں نے اپنا مقصد حیات بنالیا ہے، اس لئے عمر کے اس حصے میں بھی تحریری مصروفیت سے قطع نظر مواعظ اور تدریس قرآن کا سلسلہ جاری ہے پھر انہماک کا یہ عالم ہے۔

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

رحلت:

میری زیر تصنیف کتاب "اشفاق نامہ" کے سلسلہ میں مذکورہ بالاسوانح کی کتابت ہو چکی تھی کہ مالک تقدیر کی جناب میں مولانا موصوف کا بلاوا آگیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۵ء اتوار کا دن تھا۔ ان کا مستقل قیام برادر عزیز عبدالحق تمنا کے ساتھ ۱۸-A بلاک I گلشن اقبال میں تھا۔ یکایک تقریباً ۱۲ بجے دن تمنا کے ساتھ میرے یہاں (K-4/2 معمار پلازہ) آگئے۔ طبیعت کئی دن سے مضمحل تھی۔ ایک مختصر خط کے ذریعہ مجھے لکھا تھا کہ کھانے کے بعد سینہ میں درد ہوتا ہے۔ ریاحی تکلیف سمجھ کر انہیں دوا بھیج دی گئی تھی۔ آتے ہی فرمانے لگے۔ دوا سے تکلیف کی شدت میں کمی آگئی ہے اور فوری افاقہ بھی ہوتا ہے مگر اس کے بار بار پلٹ آنے سے تحریری کام کا نقصان ہو رہا ہے۔ نقاہت چہرہ سے ظاہر تھی۔ میں نے ان کے لیٹنے کا انتظام کیا اور عرض کیا کہ آپ دو چار دن یہیں قیام کریں، انشاء اللہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ حسب حال دوائیں تجویز کیں جن سے خاصہ افاقہ ہوا۔ ۲ بجے مجھے قریب بٹھا کر فرمانے لگے، اس دوا سے سکون ضرور ملا ہے مگر خیال رکھنا عین ممکن ہے میرا وقت آگیا ہو، میں دلاسا دیتا رہا۔ ساڑھے چار بجے تک خاصے چاق و چوبند ہو گئے اور بضد ہوئے کہ میں اپنی ضرورت کی چند چیزیں لے آؤں، پانچ بجے تمنا اور میرے بھانجے احمر صدیقی آگئے۔ ان کے ہمراہ چلے گئے۔ مغرب کے آدھ گھنٹہ بعد خوش خرم واپس آئے۔ چھوٹا سا پلاسٹک بیگ ہمراہ تھا جس میں ہیرنگ ایڈ، زیر تحریر مضمون کا مسودہ، سادہ کاغذ، کئی قلم، ذاتی لیٹر پیڈ اور وصیت نامہ تھا۔ اس کے علاوہ چند کپڑے، دن میں میرے اصرار پر انگل نگل کر ساگودانہ کھایا تھا۔ عشا سے قبل طلب کر کے شوربا اور چپاتی کھائی۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ ساڑھے دس بجے رات تک احمر صدیقی کے ساتھ باتوں اور نصیحتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کئی راتیں بے چین گذری تھیں، وظائف سے فراغت کے بعد تقریباً گیارہ بجے سو گئے۔ مجھے ان کی طرف سے تشویش تھی، بار بار جا کر دیکھتا تھا کہ دوا پلادوں مگر جگانا خلاف مصلحت تھا۔ ڈیڑھ بجے مجھے خود نیند آگئی۔ ڈھائی تین بجے کے درمیان ایک عجیب خواب دیکھا، آنکھ کھل گئی۔ جلدی سے جا کر دیکھا تو سو رہے تھے۔ پنکھا تیز چل رہا تھا، کسی قدر خنکی تھی اور ان کے پیر کھلے ہوئے تھے۔ میں پیر ڈھانکنے لگا تو انگلیاں انگوٹھوں سے مس ہو گئیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت ٹھنڈے تھے۔ میں تلوے سہلانے لگا، خلاف معمول پھر بھی نہ چونکے تو پنڈلیاں دبانے لگا، پھر نبض ٹٹولی اور ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ گردن بائیں جانب (سمت کعبہ) مڑی ہوئی تھی اور روح پرواز کر چکی تھی، اناللہ وانا الیہ راجعون، یہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء، پیر کا دن (مطابق ۲۷ جمادی الاوّل ۱۴۱۶ھ) اور تہجد کا وقت تھا۔ اکثر دعا کرتے تھے کہ اللہ مجھے محتاج نہ کرنا اور اللہ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ دوپہر تک کراچی کے علمائے کرام کے علاوہ، معتقدین اور شاگردوں کا ہجوم ہو گیا جو میت گاڑی موجود ہونے کے باوجود از راہ عقیدت مسجد تک جنازہ کاندھوں پر کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے لے گئے۔ مسجد قبا گلشن اقبال میں مولانا محمد یوسف بنوری کے داماد اور مجلس علمی کراچی کے سربراہ مولانا محمد طاسین مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ متعلقین کی اجازت سے انہیں مقدس ہاتھوں نے عزیز آباد (یٰسین آباد) کے قبرستان پہنچ کر جسد خاکی قبر میں اتارا اور مٹی ڈال دی۔ نور اللہ مرقدہ و دامت برکاتہ۔ اس وقت دن کے تقریباً تین بجے تھے۔

سیرت و اخلاق:

میرا بچپن اور لڑکپن ان کے ساتھ گزرا۔ عمر میں پانچ سال بڑے تھے مگر کھیل کود میں برابری سے میرے شریک رہتے تھے اور بڑی سے بڑی غلطی کے باوجود مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی میرے اوپر ہاتھ اٹھایا ہو۔ لکھنؤ میں جب میں آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا "ناول بینی" کا شوق ہو گیا۔ تفریحی اور اصلاحی کتابوں تک تو وہ برداشت کرتے رہے لیکن ایک دن مجھے روزالیمبرٹ (Rosa-Lambert) پڑھتے ہوئے دیکھ کر برہم ہو گئے، کتاب پھاڑ کر پھینک دی۔ میں کرایہ پر لاتا تھا۔ قیمت سوا روپیہ تھی۔ دوسرے دن گلے سے لگایا اور سوا روپیہ ہاتھ پر رکھ دیا کہ کتب فروش کو دے دینا۔

والدین کی اطاعت اور محبت کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان کی خواہش پر ایک بار نہیں، کئی بار روزگار اور ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ کسی کے خلاف خواہ ان کا مخالف ہی کیوں نہ ہو غیبت پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ دوسری جانب سے معذرت کے بغیر معاف کر دیتے تھے۔ اہل خاندان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے زمین کی خاطر والد کو اذیتیں دیں مگر مولانا نے ان سے کبھی پرخاش نہیں رکھی، وقت پر ان کے کام آئے، اس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ بھائی بہنوں کے حق میں غیر معمولی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کسی کے پھانس بھی لگ گئی تو بے چین ہو جاتے تھے، پھونکیں ڈال رہے ہیں، نسخے لکھ رہے ہیں، اپنی جیب سے دواء المسک اور خمیرہ مروارید لئے چلے آرہے ہیں اور دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ مجھے آزمائش میں نہ ڈالنا انہیں شفا عنایت فرمانا۔ خاتون خانہ ان سے تقریباً پانچ سال عمر میں بڑی تھیں۔ مشترکہ خاندان میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کی ہر خواہش کا احترام کرتے تھے، ہندوستان کے دوران قیام بھی انہیں الگ رکھا اور پاکستان میں بھی علیحدہ مکان دلا دیا۔ جب تک وہ صحتمند رہیں خانگی امور میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور آخر عمر میں جب وہ مفلوج ہو گئیں تو ان کے قریب ہی دوسرے پلنگ پر لکھتے پڑھتے تھے اور ان کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ مرحومہ اپنے طور پر بھی خوشحال تھیں، میکہ سے بہت کچھ ملا تھا جو خاتمہ زمینداری کے بعد اپنے اقربا کو بے تکلف عطیہ کرتی رہیں مگر مولانا نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ ان کے بعد ان کا مسکونہ مکان فروخت کر کے حاصلات بسلسلہ صدقہ جاریہ ایک دینی ادارہ کے لئے عطیہ کر دیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لطف یہ کہ اولاد کے سلسلہ میں زوجہ محترمہ کی قدرتی نااہلی کا علم ان کو شادی کے دو ڈھائی سال بعد ہی ہو گیا تھا۔ اس کو منشائے الٰہی تصور کرتے ہوئے قبول کیا اور والدین کی اجازت اور اشارہ کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔

ان کی شفقت انسانوں ہی تک محدود نہیں تھی۔ پالتو جانوروں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ عام طور پر علما اور متشرع اصحاب کتے سے سخت متنفر ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ جانوروں کی حرکتوں پر مسکراتے تھے۔ ایک چھوٹا سا رشیئن کتا ان سے مانوس ہو گیا تھا فجر کے وقت مسجد تک ساتھ آتا جاتا تھا۔ اپنے ناشتہ سے بچا کر کچھ نہ کچھ اس کو ضرور کھلاتے تھے۔ اور کہتے تھے "اس میں اصحاب کہف کے کتے کی خو بو ہے، اللہ کے گھر تک میری رہنمائی کرتا ہے"۔ بلی، طوطے، کبوتر، مرغ اور چڑیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ انہیں وقت پر دانہ پانی دینے کی تاکید کرتے تھے اور کوئی نہ ہو تو خود کھلانے پلانے بیٹھ جاتے تھے۔ ہندوستان میں کبھی کبھی شکار پر بھی جاتے تھے مگر چھوٹے چرند و پرند کو کبھی نشانہ نہیں بنایا۔ بندوق ہمیشہ سے پسندیدہ ہتھیار رہی۔ مگر پاکستان میں صرف ریوالور تک محدود رہے۔ جس کا استعمال کبھی نہیں ہوا۔ آٹھ نو سال کی عمر سے نماز اور روزہ کبھی قضا نہیں کئے، تہجد اور اشراق کے بھی پابند تھے۔ نمازیں طویل ہوتی تھیں۔ جماعت کا خاص اہتمام تھا۔ کراچی میں گھر کے پاس دو مسجدیں تھیں ایک 'پرشکوہ' اور دوسری 'غریبا سی' پنج وقتہ کے علاوہ جمعہ بھی اس دوسری مسجد میں پڑھتے تھے اور کبھی کبھی روزہ بھی وہیں کھولتے تھے۔ ہندوستان کے دوران قیام دو بار فریضہ حج ادا کیا اور پاکستان سے کئی بار عمرے کئے۔ ہندوستان میں چھوٹے جانوروں کی اور پاکستان آنے کے بعد مالی حالات کی مجبوری سے عید میں گائے کی قربانی کرتے تھے اور اپنا حصہ بھی اہل حاجت میں تقسیم کر دیتے تھے۔

جوانی میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوئے۔ ان کے بعد مختلف حالات میں مولانا محمد عیسیٰ الٰہ آبادی، مولانا عبد الرحمان کیمبلپوری اور مولانا شاہ وصی اللہ پھولپوری (ثم الٰہ آبادی) رحمھم اللہ سے نہ صرف اصلاحی تعلق قائم رہا بلکہ مدتوں ہم نشینی کا شرف بھی حاصل رہا۔ مولانا شاہ وصی اللہ اور عارف باللہ ڈاکٹر عبد الحیؒ کی جانب سے مجاز بیعت تھے۔

بینک کے کسی شعبہ میں پیسہ لگانا، حساب رکھنا یا این آئی ٹی اور سرکاری بہت کی اسکیموں میں سرمایہ کاری ناجائز تصور کرتے تھے۔ جس ادارہ میں کام کرتے تھے اس کا کاغذ تک ذاتی صرف میں نہ لاتے تھے۔ کسی سے کوئی چیز منگاتے، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہو اصرار کر کے قیمت ادا کر دیتے تھے۔ اپنے ذاتی کام خود انجام دیتے تھے، چھوٹے یا عقیدتمند کوئی حقیر خدمت کرنا چاہتے تو روک دیتے تھے، بیماری کی حالت میں بھی پیر دبانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ غیر محرم یا غیر شرعی لباس میں خواتین ہوتیں تو محفل میں شرکت سے انکار کر دیتے تھے۔ رشتوں کی مجبوری سے کسی تقریب میں شریک ہونا ہی پڑتا تو بیٹھنے اور کھانے کے لئے دور دراز میز کا انتخاب کرتے تھے جہاں خواتین کا گزر نہ ہو، کھڑے کھڑے کھانے کا جدید رواج سخت ناپسند تھا، ہمیشہ بیٹھ کر کھاتے تھے اور ہمراہیوں کے بیٹھنے کا انتظام بھی کرواتے تھے۔

عبا و قبا، جبہ و دستار کبھی استعمال نہیں کی، فرماتے تھے "ان سے استکبار کی بو آتی ہے" لمبا کرتا، ٹخنے سے اونچا علیگڑھ کٹ پجامہ، اوپر شیروانی یا صدری، سر پر دو پلی یا کشتی نما ٹوپی اور رومال پہنتے تھے، سردی زیادہ ہوئی تو سوئیٹر یا اوپر نیچے دو شیروانیاں پہن لیتے تھے۔ ایک دن کسی نے پوچھا حضرت یہ کیا! مسکرا کر کہنے لگے "اس میں حیرت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا بات ہے بھئی" اوپر والی شیروانی ہے اور نیچے زیروانی"

فرائض و عقائد کے بارے میں کج بحثی سے چڑ جاتے تھے۔ ان کا عالم جوانی تھا۔ رشتے کے ایک نانا جو صوم و صلوٰۃ سے منحرف تھے۔ نجات آخرت کے سلسلہ میں بار بار فقد قال لاالٰہ الااللہ من دخل الجنۃ، کی تکرار کر رہے تھے۔ آخر مولانا بے تاب ہوگئے اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ اس مقدمہ کا بہتر فیصلہ تو اللہ ہی کرے گا۔۔۔۔ میں بہت چھوٹا ہوں اور میرا کام صرف ابلاغ ہے۔ لیکن مخاطب سنجیدہ ہوتا تو دلیل اور منطق سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے تاہم اثنائے گفتگو لب و لہجہ میں تلخی آجاتی تو رخصت کرنے سے قبل بے تکلف معافی مانگ لیتے تھے۔

مہمانوں کا استقبال مسکرا کر کرتے تھے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز موجود ہوتی تو ضرور پیش کرتے تھے۔ آنے والا کم عمر ہوتا تو اصرار کر کے کھلاتے تھے۔ خواہ کتنا ہی اہم کام زیر تحویل ہو جب تک ملاقاتی خود اجازت طلب نہیں کرتا تھا نماز کے اوقات کے سوا مصروفیت یا ماندگی کا عذر کر کے رخصت کا اشارہ نہیں دیتے تھے۔ ملاقاتی سے بے تکلفی نہ ہوتی تو باتوں باتوں میں ارکان دین اور اتباع سنت کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے تھے۔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اصحاب رسول ﷺ کی شان میں معمولی سی کوتاہی بھی ناقابل برداشت تھی، اس کے باوجود مخالفوں اور غیر مسلم اکابر کے نام احترام سے لیتے تھے۔

نہایت رقیق القلب، بلالحاظ کافر و مومن کسی کو دکھ درد میں مبتلا دیکھتے تو بے چین ہو جاتے۔ اس کے حق میں دعائیں کرتے، پھونکیں ڈالتے اور ضرورت ہوتی تو تیمارداری میں لگ جاتے تھے۔ مریض یا اس کے اہل خانہ کی طرف سے تقاضہ ہوتا تو نسخہ بھی تجویز کر دیتے۔ طب یونانی میں مہارت اور ہاتھ میں شفا تھی۔ کئی بار ناقابل علاج امراض میں لوگوں کو شفا ہوئی۔ سخت سے سخت صدموں کے موقعوں پر غیر معمولی ضبط و تحمل سے کام لیتے تھے۔ عزیز ترین بھائی اور بہن کی وفات بھی اس تحمل میں رخنہ نہیں ڈال سکی مگر والد گرامی کی رحلت پر داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ فرماتے تھے ولی کامل تو وہ تھے (والد) جو رشوت اور جرائم کے سمندر سے صحیح سلامت گزر گئے۔ میں کیا ہوں، ان کی بدولت ترغیبات دنیا، اس شدت سے میرے راستہ میں حائل ہی کہاں ہوئیں کہ اپنے اتقاء پر بھروسہ کروں۔

کانوں کی معذوری ایک حد تک موروثی تھی۔ سماعت میں خرابی کئی سال سے تھی مگر آخر عمر میں بہت اونچا سننے لگے تھے۔ ایک دن ایک بے تکلف کرم فرما نے کہا "مولانا! اس کا علاج کیوں نہیں کرتے!" کہنے لگے "قبلہ! یہ تو اللہ کی رحمت ہے دوسروں کی غیبت اور اپنے حق میں مذمت سننے سے الگ بچتا ہوں اور گرد و پیش کے شور شرابے سے محفوظ، دین کے کاموں میں لگا رہتا ہوں"

حصول علم کے معاملہ میں "ولوکان بالسین" کے قائل تھے۔ انگریزی زبان و ادب میں تو خاصی دستگاہ انہیں دنوں حاصل کر لی تھی۔ جب منبع الطب کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ مگر ہومیوپیتھک، جدید فلسفہ و معاشیات، ملٹری سائنس، علم المذاہب، فلکیات، فزکس، بیالوجی اور تاریخ کا مطالعہ مختلف اوقات میں بطور خود اس انہماک سے کیا تھا کہ اچھے اچھے سند یافتہ اصحاب کی اصلاح کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود ضرورت ہوتی تو معلومات اور استفادہ کے لئے چھوٹوں اور کم درجہ اہل علم سے بھی بے تکلف رجوع کر لیتے تھے۔ فارسی اور ہندی سے شغف کی بدولت مجھے اکثر یہ شرف حاصل ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حافظہ نہایت عمدہ بلکہ قابلِ رشک تھا۔ بیاسی سال کی عمر میں بھولے بسرے واقعات کے دن تاریخ اور کتابوں کے صحیح حوالے بتا دیتے تھے۔ دین اور دین کی صلاح و فلاح مرغوب موضوع تھا۔ ہر علم کو دینی نقطۂ نظر سے پرکھتے تھے۔ اور اکثر اس کے حوالہ سے دین کے مسلمات کی تشریح و تائید کرتے تھے۔ عقائد اہل سنت کے پس منظر میں تاریخ کی چھان پھٹک، راوی اور روایت کا علم رجال اور عقلی و علمی دلائل کی روشنی میں جائزہ لے کر قلم اٹھاتے تھے۔ لکھنے بیٹھتے تھے تو گرد و پیش کی خبر نہیں رہتی تھی، سوائے اس کے کہ نماز کا وقت آجائے یا کوئی ملاقاتی کھٹکا کر کے بیدار کر دے۔ علما و صلحا بالخصوص مجددین پر جو وقت پڑتا رہا ہے اس سے وہ بھی نہ بچ سکے اور محض اختلاف رائے کی بنا پر اکثر ہم عصروں کی جانب سے تحقیر و تکفیر کا نشانہ بنتے رہے مگر ایسے اصحاب کو براہ راست مناسب جواب دینے کے باوجود غیبت میں نام لے کر ان کی مذمت کبھی نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک ہمدرد نے ٹوکا "آپ سرِ محفل ایسے خود پرست اہل علم کو بے نقاب کیوں نہیں کرتے!" فرمایا عزیزم! مجھے اختلاف علم کے بارے میں ان کی رائے سے ہے، مجرد علم سے نہیں کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر فتوے صادر کرنے لگوں۔ مزہ تو اخلاق انبیاء کی پیروی میں ہے، نفس کی تسکین میں نہیں۔"

چنانچہ ذاتی ڈائری میں جہاں انہوں نے احبا کی بے مہری کا ذکر کیا ہے وہاں نام لئے بغیر صرف یہ جملہ ملتا ہے "کاش ہم علما میں ہمچو من دیگرے نیست" کی بیماری نہ ہوتی تو آج امت مسلمہ میں یہ انتشار بھی نہ ہوتا جس نے ہماری قوت کو گروہ در گروہ تقسیم کر دیا ہے۔ بہر حال میں سب کو تہہ دل سے معاف کرتا ہوں کہ روز محشر حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے روبرو میرا دل کثافت و رنجش سے پاک ہو۔"

دین کی لگن اپنی جگہ، مگر غربت و افلاس کے مارے ہوئے بندگان خدا کی مادی فلاح و بہبود بھی ان کے نزدیک کم توجہ طلب نہیں تھی۔ چنانچہ دونوں محاذوں پر انہوں نے فعال کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے کم از کم دو اداروں کے بانیوں میں شامل تھے۔ اور ان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کرتے رہتے تھے۔ پہلا ادارہ "شمشاد فاکر ٹرسٹ (رفاہی) کراچی کے نام سے قائم ہوا جسے ان کے منجھلے بھائی شمشاد حسین فاکر نے ۱۹۸۵ء میں رجسٹرڈ کرا دیا۔ یہ ٹرسٹیوں کی زیر نگرانی عوام کو ہومیوپیتھک علاج کی سہولت، دینی اور دنیوی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف اور شرعی ضروریات کے لئے غربا کو مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ اشاعت دین کے لئے ہر اقدام کا مجاز ہے۔ مولانا مرحوم نہ صرف اس کے سرپرست بلکہ "امین خزانہ" بھی تھے اور انہوں نے اپنی صوابدید سے میمورنڈم کی بعض شقوں میں ترمیم کرا کے غیر سنی عناصر پر اس کا داخلہ بند کر دیا۔ دوسرا ادارہ وقف "دائرۃ المعارف" کے نام سے احسن آباد، کراچی میں قائم کیا اور تنہا اپنے وسائل سے پلاٹ (زمین) مہیا کر کے چند علمائے کرام پر مشتمل ٹرسٹ کے سپرد کر دیا۔ اسکا مقصد نشر و اشاعت کے ذریعہ تبلیغ دین کے علاوہ ایسی درسگاہ کا قیام ہے جہاں فارغ التحصیل طلباء کو جدید معاشی اور سائنسی علوم کی تعلیم بھی دی جائے تا کہ اس دور کے تقاضوں کے پیش نظر تبلیغ اسلام کا فریضہ بہتر طریقہ پر انجام دیا جا سکے۔

مولانا مرحوم (سرپرست اعلیٰ) کے بعد فی الحال یہ ادارہ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی اور ان کے پانچ رفقا کی سرپرستی میں زیر تکمیل ہے۔

ایک معزز با اثر اور کھاتے پیتے گھرانے کے فرد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے کو کبھی رئیس نہیں گردانا۔ کبھی خاندانی خطاب (چودھری) نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا۔ کبھی بزرگوں کی امارت پر فخر نہیں کیا۔ امراء و رؤسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ملنے جلنے میں کبھی فوقیت نہیں دی۔ اوسط حال لوگوں کی طرح زندگی بسر کی، غریبوں میں گھل مل کر زیادہ وقت گزارا۔ نیکی اور خیر کے لئے ہاتھ کھلے رکھے۔ خست اور دولت سے اجتناب اور الفقر و فخری پر کار بند رہے، کل کی فکر کبھی نہیں کی انتقال کے وقت کسی کمپنی کے نو ہزار روپیہ قیمت کے حصص اور سات ہزار روپیہ نقد کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اور نقد کے بارے میں یہ وصیت تھی کہ تکفین و تدفین کے جملہ مصارف اس رقم سے پورے کئے جائیں۔ نہ ہار اور پھول پر پیسہ ضائع کیا جائے نہ تقریبات بعد از مرگ، کا اہتمام کیا جائے۔ مختصر یہ کہ نہایت محتاط زندگی گزارنے کے باوجود کبھی خود احتسابی سے غافل نہیں ہوئے اور تادم آخر فی سبیل اللہ دامے درمے قدمے سخنے دین متین کی خدمت کرتے ہوئے، طویل بیماری کی صعوبت سے محفوظ، محتاجی سے بے نیاز مرگ ناگہانی سے بے تکلف گزر گئے۔ اس طرح جیسے بہت مدت کے بعد موسم بدلا ہے۔ بہشت کی خواب آور ہواؤں نے سکون بخشا ہے۔ تھکے ہوئے مسافر نے آنکھیں بند کرلی ہیں اور نغمہ لاالٰہ پر رقص کرتی ہوئی روح اس منزل کی طرف رواں دواں ہے جہاں اس کا مطلوب و مسعود، فاذکرونی اذکرکم کا داعیٔ حقیقی، اس کو صلہ دینے کا منتظر ہے۔ یرفع اللہ الذین آمنو منکم والذین اوتوالعلم درجات۔ (سورۃ مجادلہ، آیت ۱۱)

ترجمہ (اللہ ان کو جو مؤمن ہیں اور علم حقیقی رکھنے والے ہیں، درجات میں بڑھا دے گا۔)

احرار ختم نبوت سنٹر کی تعمیر

جدید مرکز احرار دارالعلوم ختم نبوت اور احرار ختم نبوت سنٹر مقابل مرکزی مسجد عثمانیہ، معاویہ چوک، ہاؤسنگ سکیم چیچا وطنی۔ کی تعمیر کا کام جاری ہے ضلع ساہیوال بالخصوص علاقہ چیچاوطنی کے ساتھی خصوصی توجہ فرمائیں۔

رابطہ:۔

دفتر احرار جامع مسجد بلاک نمبر ۱۲ چیچا وطنی۔

(بقیہ از ص ۵۷)

کی جگہ افسردگی، اضمحلال اور مایوسی لے لیتی ہے۔

الغرض ہنی مون کی اصطلاح اور اس سفر کو ہمارے سماج اور ہماری دینی اقدار سے قطعاً مناسبت نہیں۔ شادی کے خوشگوار لمحات سے لطف اندوز ہونا ایک فطری امر ہے مگر اپنے اطوار، اپنی تہذیب اور اپنی اقدار کے ساتھ، نہ کہ کفار و مشرکین کے طور طریقوں پر۔۔۔۔ مسلمانوں کو دیگر رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ اس رسم بد سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے۔

© rasailojaraid.com